اُردو ادب میں فیمنزم ...... تحقیقی مطالعہ

ڈاکٹر محمد ہارون قادر، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract

There is visible feminist element in urdu literature. In this article, has been explored the debates of feminism in early urdu fiction of female writers and then some well known urdu poets like Fehmida Riaz and Sara Shugafta etc. This article shows that feminist literary approach is very much present in urdu literature with reference to social status of women in eastren society.

اُردو ادب میں تانیثیت کا باقاعدہ شعور تو بیسویں صدی میں ہی پیدا ہوا لیکن اس کے پس منظر میں ہمیں بہت سی ایسی نسائی تحریریں نظر آتی ہیں جنھوں نے اسے باقاعدہ شعوری طور پر تو نہیں اپنایا مگر لاشعوری طور پر ان کی تحریروں میں اس رجحان کی جھلکیاں بڑی آسانی سے تلاش کی جا سکتی ہیں۔

چنانچہ اُردو ادب میں تانیثی شعور کی تشکیل کا آغاز خواتین کے لکھنے کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔ جیسے پہلے پہل خواتین قصہ گو اور ناول نگاروں نے علامہ راشد الخیری اور ڈپٹی نذیر احمد کے نسوانی کرداروں کے بیان کو ناکافی خیال کرتے ہوئے اپنے جہان کی حقیقت خود بیان کرنے کی ٹھانی۔ کیونکہ نذیر احمد اور راشد الخیری کے اصلاحی ناولوں میں عورت کے لیے جدید تعلیم حاصل کر کے معاشی مسائل کو حل کرنا قابلِ قبول نہ تھا چنانچہ اس دور کی ادیب خواتین نے مردوں کے طے کردہ نسوانی آزادی کے محدود تصور کو رد کرتے ہوئے اپنا نقطہ نظر خود بیان کرنا چاہا۔ ان کی یہ سوچ ایک نیا خواب تھا جس میں عورت اور مرد کے لیے یکساں آزادی کی تمنا پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اپنے مضمون اُردو کی قصہ نگار، ناول نگار خواتین میں کہتے ہیں کہ اِخواتین کی ناول نگاری کی ابتداء نذر سجاد حیدر کے ناول ''آہِ مظلوماں'' سے پہلے نہیں ہوئی۔ (اس سے پہلے کی خواتین ناول نگاروں کو وہ تمثیل نگاروں میں شمار کرتے ہیں بلکہ نذر سجاد حیدر کے آہِ مظلوماں سے پہلے کے دو ناولوں کو بھی قصہ ہی شمار کرتے ہیں) چنانچہ پہلی قصہ گو خاتون رشیدۃ النساء بیگم تھیں جنھوں نے اصلاح النساء لکھا۔ جس میں نسوانی معاشرت کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ اور اس میں اس دور کی رسموں اور اوہام کو نہایت باریکی اور تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ پروفیسر سید وقار عظیم نے اصلاح النساء کو ''مراۃ العروس'' پر ترجیح دی ہے۔ اس قصہ میں جہیز کی لعنت اور دیگر فرسودہ رسومات

پر بھی طنز کیا گیا ہے۔

اکبری بیگم جو والدہ افضل علی کے نام سے لکھتی رہیں ان کی ایک تصنیف ''گودڑ کا لال'' کا موضوع پردے کی مخالفت اور مخلوط تعلیم کے فوائد ہے۔ یوں اس دور میں اسے ایک انقلابی آواز کہا جا سکتا ہے۔ اسی دور میں بیگم مولوی سراج الدین احمد نے آزادیٔ نسواں کے موضوع پر ''ناول دکن'' لکھا۔ محمدی بیگم کے قصے صفیہ بیگم میں بچپن کی منگنی کے ہولناک نتائج کو بیان کیا گیا ہے۔

نذر سجاد حیدر آزادیٔ نسواں اور تعلیم نسواں کی تحریکوں کی سرگرم رکن رہی ہیں ان کے ناول اس مخصوص طبقے سے متعلق ہیں جنھوں نے یورپی تہذیب اختیار کرنا شروع کر دی تھی۔ ان کے ناولوں کے موضوعات دوسری شادی اور بے جوڑ شادی کے خطرناک نتائج نیز مردوں کے اندر پائی جانے والی ہوس پرستی ہے۔

چنانچہ اس اوّلین دور کے ناولوں یا تمثیلوں پر اصلاحی رنگ غالب ہے مگر ہم اس نکتۂ آغاز کو نظر انداز نہیں کر سکتے جہاں عورتوں نے پہلی مرتبہ روایت کو توڑا ہے اور احتجاجی رویہ اختیار کیا ہے کیونکہ یہی دھندلا سا احتجاج آگے چل کر واضح تانیثی شعور کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

ان اصلاحی ناولوں کے بعد خواتین کی تحریروں پر رومانوی تحریک کا اثر ہوا جس میں حجاب امتیاز علی پیش پیش رہیں۔ گو کہ وہ عورت کو بیان کرتی ہیں لیکن رومان کی دھند میں ہمیں تانیثی رجحانات نہیں مل پاتے۔ اس کے علاوہ رضیہ سجاد ظہیر اور رشید جہاں کے نام ابھر کر سامنے آتے ہیں .... گو کہ ان کا کام ترقی پسند تحریک کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی ہمیں نسوانی احتجاج کی جھلک نظر آتی ہے۔

اُردو ادب میں رومانویت کے دور کا خاتمہ حقیقت نگاری پر ہوا اور عصمت چغتائی اپنے تمام ہتھیار تیز کر کے میدان میں وارد ہوئیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تانیثی ادب کا باقاعدہ آغاز عصمت چغتائی کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ گو کہ عصمت چغتائی کے ناول اور افسانے گھروں کی چار دیواری کے گرد ہی گھومتے ہیں مگر اس چار دیواری کے اندر کون سا نسائی موضوع ہے جسے وہ زیرِ بحث نہیں لاتیں۔

عصمت چغتائی اپنی ذاتی زندگی میں بھی ایک باغی اور اکھڑ لڑکی کے طور پر سامنے آتی ہیں جو بچپن ہی سے کسی قسم کی پابندی کو قبول نہیں کرتی اور جس کا شعور عورت ہونے کی وجہ سے اپنے اوپر لگنے والی چند پابندیوں کو قطعاً جائز تصور نہیں کرتا اور ایسی کسی بھی پابندی کے خلاف کھل کر اظہار کرتی ہے اپنے رویے سے اور اپنی تحریروں کی روشنی میں وہ ایک ایسی عورت بن کر ابھرتی ہے جو کہ مردوں کے معاشرے میں رہتے ہوئے چھوٹی سے چھوٹی ناانصافی کے خلاف بھی اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

عصمت چغتائی کے ناولوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو وہی باغی رویہ سامنے آتا ہے۔ عصمت کی ہیروئن روایتی عورت نہیں ہے اور معاشرتی جسمانی اور جنسی دباؤ کے خلاف اکثر اس کا ردِعمل بے حد مختلف ہوتا ہے جیسے معصومہ میں جب معصومہ کے والد پاکستان جا کر بیاہ رچا لیتے ہیں اور اپنی بیوی بچوں کو بھول جاتے ہیں تو ان کی بیگم بجائے رونے دھونے کے اپنی انیس سالہ بیٹی معصومہ کو طوائف بنانے کا فیصلہ کرتی ہیں۔[۲] جس کے پیچھے دو وجوہات

ہیں ایک تو عصمت کے ہاں کا مخصوص رویہ کہ مردوں کے ستم کے آگے گھٹنے ٹیکنے کی بجائے بے انصافی کے خلاف شدید ردِعمل بیگم صاحبہ کے جذبۂ انتقام کو ہوا دیتا ہے اور دوسرا وہ روایتی عورت سے بالکل ہٹ کر رویہ اختیار کرتی ہیں۔ زندگی کی بے رحمی انہیں بھی بے رحم بنا دیتی ہے۔ کیونکہ ظلم کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ ظلم سہنے والا بھی سفاک ہو جاتا ہے ......تو یہ سفاکی خاوند کی طرف سے ڈھائے جانے والے ظلم کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح ضدی میں شانتا، پورن کی بے نیازی پر آہیں بھرنے اور سسکنے کی بجائے اپنی زندگی کی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے مہیش کا انتخاب کر لیتی ہے:

> ''شانتا کے سامنے بھی دو ہی راستے تھے ایک تو وہی جس پر وہ چل رہی تھی یعنی پتی ورتا ہندوستانی بیوی بن کر جگ کی لاڈلی نیک اور پارسا جہاں وہ مٹی کے ڈھیلے کی طرح لڑھک رہی تھی اس سے بھی بدتر مٹی کے ڈھیلے سے کبھی کوئی گھاس پھوس کا تنکا تو اگ آتا ہے وہ بھی کبھی کسی مصرف میں آ جاتا ہے مگر وہ تو اور ہی کچھ تھی اس ٹھنڈی چتا میں سال سے اوپر اسے جھلستے ہوئے ہو گیا تھا۔'' ۳

یہ ایک خاصی تانیثی رویہ ہے جس کے تحت عصمت عورت کو ایک مکمل انسان تصور کرتے ہوئے اس کی جسمانی ضروریات کو اتنا ہی اہم خیال کرتی ہے جتنا کہ مردوں کی جسمانی ضروریات اہم ہوتی ہیں جن کی تکمیل کے لیے وہ ایک سے زیادہ شادیاں کرتے ہیں اور اس سے بھی جی نہ بھرے تو لونڈیاں اور باندیاں تو ہیں ہی ان کی خدمت کے لیے۔

دوسرے یہ کہ عورتیں بھی مردوں کی مانند اپنی زندگی کے متعلق فیصلے کرنے کی حقدار ہیں۔ اب چاہے وہ فیصلے درست ہوں یا غلط عصمت اپنے نسوانی کرداروں کو اس کی آزادی ضرور فراہم کرتی ہیں۔

شبنم رضوی اپنی کتاب عصمت چغتائی کی ناول نگاری میں کہتی ہیں:

> ''عصمت کی ہیروئن زندگی سے سمجھوتہ تو کرتی ہے مگر اپنے وقار کو قائم رکھتے ہوئے وہ مردوں کے اس سماج سے اپنے حقوق کو مانگتی اور چھینتی نظر آتی ہے وہ باغی بھی ہے اور بھولی بھی۔'' ۴

عصمت کے ہاں عورت اپنی ذات کی سچائی کے ساتھ زندہ رہتی ہے اور خواہ مخواہ کی قربانی اور نیکی کے لیبل لگوانا پسند نہیں کرتی کیونکہ وہ جانتی ہے کہ بظاہر نیک اور شریف نظر آنے والی عورتیں اپنے اندر کس طرح خواہشات کو چھپائے رکھتی ہیں۔ اور یہ خواہشات چھپ سکتی ہیں دب بھی سکتی ہیں مگر ختم نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا اگر سیدھے راستے سے ان کی تسکین نہ ہو تو پھر یہ اپنے اظہار کے لیے پیچیدہ صورتحال کا انتخاب کر لیتی ہیں جیسے لحاف کی لڑکی اور یا پھر 'دل کی دُنیا' کی قدسیہ بیگم۔ ۵

گھروں میں جنسی گھٹن کا شکار عورتوں کے علاوہ عصمت چغتائی کے کرداروں میں ایسی کم سن اور ناتجربہ کار لڑکیاں بھی ہیں جنہیں مناسب تربیت اور تعلیم کی کمی کے باعث مناسب جنسی معلومات حاصل نہیں ہو پاتیں (مثلاً گیند اور جال جیسے افسانے) جس کے نتیجے میں انہیں نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

عصمت چغتائی کے علاوہ واجدہ تبسم نے بھی اودھ کے نوابوں کی ذاتی زندگی کی جھلکیاں پیش کرتے ہوئے بیگمات اور باندیوں کنیزوں کے مسائل پر کھل کر بات کی ہے۔

تانیثیت پر بات کرتے ہوئے قرۃ العین حیدر کے کام کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ان کے ناولٹ ''اگلے جنم موہے بیٹا نہ کیجو''، ''دلربا''، ''سیتا ہرن'' اور ''چائے کے باغ'' مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ جن میں فن سے وابستہ عورتوں سے لے کر اعلیٰ سوسائٹی میں 'موو' کرنے والی خود مختار عورتوں کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

فہمیدہ ریاض کی شاعری زیادہ تر تخلیق کے تجربے اور مامتا کے جذبے سے جڑی ہے۔ (''لاؤ ہاتھ اپنا لاؤ ذرا'' اور ''لوری'') بعض جگہ وصال اور خواہشِ وصال کے اظہار میں بھی وہ Guilt یا ندامت نہیں پائی جاتی جو ایسے موقعوں پر خواتین سے متوقع ہوتی ہے۔ ان کی نظموں سے یہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس مردانہ سماج میں عورت کی حیثیت محض اتنی ہے کہ وہ بچے پیدا کرے اور مرد کی حسِ لطیف کی تسکین کا سامان کرے۔ لہٰذا اس حقیقت کو کسی طور تسلیم ہی نہیں کیا جاتا کہ وہ ایک دماغ بھی رکھتی ہے۔

ایک جگہ کہتی ہیں:

محرومی سے اجڑی صورت
رسوائی سے آنچل میلا
چپکے چپکے آنسو پونچھوں
نہیں نہیں، میں روتی کب ہوں
اس کا مجھ کو دھیان کہاں ہے
مجھ پر تم انگلی نہ اٹھاؤ
یہ گیلی لکڑی کا دھواں ہے

گویا ایک عام لڑکی کے احساسات کا اظہار ہے جن میں عورت کی منفرد Sensibility کا اشارہ ملتا ہے۔

سارا شگفتہ کے ہاں بھی تانیثی رجحانات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس کی چار شادیوں کی ناکامی اور پھر خودکشی کے دوران پیش آنے والے تمام واقعات ہمیں اس سماج میں عورت کی حیثیت اور اس کے استعمال سے آگاہ کرتے ہیں۔ سارا کی زندگی کے حالات ہمیں امرتا پریتم کی لکھی ہوئی کتاب ''ایک تھی سارا'' اور احمد سلیم کی لکھی ہوئی کتاب ''مردہ آنکھیں زندہ ہاتھ'' میں ملتے ہیں۔ سارا بے حد حساس شاعرہ تھی اور اپنے نسوانی پن کے متعلق بے حد Conscious بھی تھی۔ اس کی نظمیں خاصی ڈائریکٹ ہیں مگر سچی اور زندگی سے بھرپور ہیں۔ اس کے ہاں سب سے زیادہ احتجاج اپنے عورت ہونے کے باعث خود پر اٹھنے والی غلط نظروں کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس نے شادی شدہ عورت کی حیثیت سے شوہروں میں پائی جانے والی فرعونیت کا لبادہ بھی تار تار کیا ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے مصرعے تازیانوں کی طرح لگتے ہیں۔ وہ اپنے شوہر کی زبان سے نکلے ہوئے چند فقرے یوں رقم کرتی ہے:

''کیا لکھ رہی ہو؟ ادھر آؤ میرے پاؤں دباؤ۔ بڑی آئی شاعرہ۔''

یا پھر

''ہر وقت زیور پہنے رہا کرو اس سے عزت ہوتی ہے۔''

اور سارا جواب میں کہتی ہے:

''سونا دھات ہے اور میں سونے یعنی دھات سے زیادہ جیتی ہوں۔ میں ہنستی ہوں۔ ایک جبر سے دوسرے جبر تک۔''

اور پھر اس کے لہجے کی تلخی شدت اختیار کر جاتی ہے:

''چار دیواری کے نام پر تم دھبہ ہو، یہ دھرتی ہمارا گھر ہے کھلا آسمان ہماری چھت تم کون ہوتے ہو چاند سورج کو چھپانے والے۔''

''برقع تم بھی پہنو گے......سر تم بھی ڈھکو گے۔''

''منے کے ابا دینا ذرا چار آنے۔ یہ فقیروں سی ادائیں کب ہماری تھیں۔ فرعونیت تم نے کی، عورت کبھی فرعون نہ تھی نہ ہے اور نہ کبھی پیدا ہوئی۔''

پروین شاکر بھی اس حد تک تانیثی رجحان رکھتی ہیں کہ ہمیں ان کے ہاں عورت کے جذبات و احساسات اپنی خالص حالت میں نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

بھیڑیے
میرے چاروں طرف بھیڑیے
آنکھیں، حلقوں سے باہر
زبانیں بھی نکلی ہوئی
دھونکنی کی طرح سانس چلتی ہوئی

معاصر اُردو ادب میں ہمیں کشور ناہید اور زاہدہ حنا کے ہاں تانیثی رویہ نظر آتا ہے۔ خصوصاً کشور ناہید کے ہاں احتجاجی رنگ بہت شدت اختیار کر جاتا ہے اور ہمیں ان کی تحریروں میں این سیکسٹن کے نظریات کی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظم ''بند دروازے سے جھانکتی چیخ'' میں عورت کے وجودی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ اسی نظم میں لکھتی ہیں:

سارا گھر چیزوں اور آوازوں سے بھر گیا
صبح کی روشنی میں دیکھا
تو زرد عورت پھر موجود تھی

مغربی اور مشرقی ادب میں تانیثیت پرستوں کے رجحانات کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ یہ کم و بیش ملتے جلتے ہیں۔ فرق محض اتنا ہی ہے کہ مغرب میں عورت کے نفسیاتی مسائل

اور مردوزن کے ریلیشن شپ (Relationship) پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور مشرق کے رویے زیادہ تر عورت کی سماجی آزادی کے گرد گھومتے ہیں۔اس سلسلے میں شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون انتہائی اہم ہے۔[۶]

صدیوں سے رواں دواں یہ نظام جسے ہم پٹریارکی کے نام سے جانتے ہیں کیا کبھی اپنے انجام کو پہنچ سکے گا؟ کیا دُنیا کے مختلف خطوں کے مختلف شعبوں میں اس نظام کے خلاف اُٹھنے والی فیمی نسٹ آوازیں کوئی انقلاب لا سکیں گی؟ کیا کبھی دُنیا میں مادری یا میٹریارکیکل نظام رائج ہو سکے گا اور ہوا تو اس کی کیا صورت ہوگی۔ فیمی نزم پر بات کرتے ہوئے اس جیسے کتنے ہی سوال ہمارے ذہنوں میں بیدار ہوتے ہیں مگر ان کے جواب ڈھونڈنے کے لیے ہمیں ابھی کئی صدیوں کی مسافت طے کرنا پڑے گی۔

نوٹ:

تانیثی تنقید کے لیے دیکھیے شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون تانیثیت کی تفہیم مطبوعہ انتخاب خواتین کا عالمی ادب (سہ ماہی ادبیات ۲۰۰۲ء جلد ۱۵۔۱۴، اسلام آباد)۔

حواشی:

۱۔ حامد بیگ، ڈاکٹر، مرزا، ''اُردو کی قصہ نگار، ناول نگار خواتین''، مشمولہ: ماہِ نو اگست، ۱۹۹۷ء

۲۔ عصمت چغتائی، ''معصومہ''، لاہور: چودھری اکیڈمی، ۱۹۹۸ء

۳۔ عصمت چغتائی، ''ضدی''، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص: ۴۴

۴۔ شبنم رضوی، ''عصمت چغتائی کی ناول نگاری''، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۰ء، ص: ۵۹

۵۔ عصمت چغتائی، ''دل کی دُنیا''، لاہور: چودھری اکیڈمی، ۱۹۹۰ء

۶۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ''تانیثیت کی تفہیم''، مشمولہ: سہ ماہی ادبیات، جلد ۸،۱۴، اسلام آباد: ۲۰۰۲ء